شکر گزار دل

میری کوشش ہوتی ہے کہ جہاں ممکن ہو، میں کسی پیدل چلنے والے کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اس کی منزل تک لفٹ دے دیا کروں۔ پچھلے دنوں ایک صاحب کو میں نے لفٹ دی۔ ان کا رویہ عام لوگوں سے بہت مختلف تھا۔ انھوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی انگریزی میں میرا شکریہ ادا کیا۔ گرچہ یہ انگریزی غلط تھی۔ اس کے بعد گاڑی میں ان سے مزید گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو سے اندازہ ہوگیا کہ گرچہ وہ ایک بہت کم تعلیم یافتہ دیہاتی پس منظر کا نوجوان ہے مگر تہذیب یافتہ ہے۔ بار بار اس نے مختلف پہلوؤں سے میرا شکریہ ادا کیا۔

ایک دیہاتی کم تعلیم یافتہ نوجوان جو شہری کلچر میں ڈھلنے کی کوشش کر رہا ہو اور غیر فصیح انگریزی کا جملہ کہیں سے سن کر بار بار دہرا رہا ہو، بظاہر شہری لوگوں کے ہاں مذاق کا موضوع بن جاتا ہے۔ مگر اس کے اندر جو شکر گزاری کا احساس تھا وہ اس کی پوری شخصیت پر حاوی ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اس کی منزل پر اتارا تو مجھے اس کی گفتگو سے زیادہ اس کی شخصیت کا یہ پہلو یاد رہ گیا۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم میں سے ہر شخص کی حیثیت اس نوجوان کی سی ہے۔ ہم جب اللہ کی نعمتوں کا بہترین طریقے سے بھی شکر ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی شان کے مقابلے میں ہم ایک گنوار، جاہل اور بے وقعت انسان سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔ مگر اس کے باوجود وہ قرآن میں یقین دلاتے ہیں کہ میں اپنی شان کو نہیں تمھارے دل کو دیکھتا ہوں۔

ایسے میں جو بندہ اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرے وہ اس کی ہر کمزوری کو بالائے طاق رکھ کر اسے اپنے محبوب بندے اور بندی کے طور پر یاد رکھتے ہیں۔ وہ اس کی خطاؤں سے چشم پوشی کرتے اور اپنی نعمتیں بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اس کے بے وقعت الفاظ اور شکریہ کو نہیں اس کے دل کو دیکھتے ہیں۔ یہی شکر گزار دل خدا کا مطلوب ہے مگر یہی دل اکثر ناپید ہوا کرتا ہے۔

عبدالستار ایدھی: ایک علامت

عبدالستار ایدھی کا انتقال ہو گیا۔ مگر ان کے انتقال پر قوم کا جو رد عمل سامنے آیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ اس معاشرے کو جو کچھ وہ دے کر گئے وہ بہت غیر معمولی ہے۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ان کی خدمات اتنی زیادہ ہیں جو کسی ایک مضمون میں گنوائی نہیں جا سکتیں، مگر میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ وہ اس معاشرے کے زندہ ہونے کی ایک علامت بن گئے۔

ہمارے ہاں سیاست کو اتنا زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے کہ جس شخص میں معاشرے کی خدمت کا کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ چھوٹتے ہی سیاست کے میدان میں کود جاتا ہے۔ ایدھی صاحب نے بھی کارزارِ سیاست سے زندگی کا آغاز کیا، مگر ان کی اور قوم کی خوش قسمتی تھی کہ جیسے ہی وہ اس میدان میں ناکام ہوئے، انھوں نے اپنا رخ تبدیل کیا اور خدمت کے میدان میں اتر گئے۔

یہ وہ میدان تھا جو ان سے قبل بڑی حد تک خالی پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اونچی چھلانگ لگانے کے بجائے ممکن سے آغاز کیا۔ عام لوگوں کی خدمت کے لیے وہ عام لوگوں کے پاس گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ یہ شخص واقعی کام کر رہا ہے۔ پھر معاشرے کے عام لوگوں نے اپنے وسائل ان کو دے دیے۔ عام لوگوں کی اِسی مدد سے انہوں نے خدمت کی ایک پوری ایمپائر قائم کر دی۔ یہی نہیں بلکہ وہ آنے والے ان گنت لوگوں کے لیے ایک رول ماڈل بن گئے اور نجانے کتنے لوگ ان سے متاثر ہو کر خدمت کے مختلف شعبوں میں معاشرے کی خدمت کرنے لگے۔

ایدھی صاحب نے ثابت کر دیا کہ یہ معاشرہ ابھی زندہ ہے۔ مخلص اور دردمند شخص کا ساتھ دینے والے بہت لوگ ابھی باقی ہیں۔ ایدھی صاحب کی خدمت ایمپائر معاشرے کی زندگی کی علامت ہے۔ یہ آنے والوں کے لیے ایک زندہ سبق ہے کہ اس قوم سے مایوس ہونے کے بجائے درست میدان کی سمت قوم کی رہنمائی کرنے کا اصل کام ہے۔

ایدھی صاحب: باعث فخر باعث ندامت

ایدھی صاحب جیسی ہستی کا وجود کسی بھی قوم کے لیے باعث فخر ہے۔مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کا کام کسی بھی ریاست کے لیے باعثِ ندامت ہے۔انہوں نے ساری زندگی جو کام کیا یعنی خدمت خلق اور جس طبقے کے لیے کیا یعنی غریب ترین لوگ، یہ کام اور یہ لوگ اصلاً ریاست کی ذمہ داری تھے۔ یہ کام اگر کسی فرد واحد ہی نے کرنا ہے تو پھر ریاست کا کیا فائدہ؟ لوگ اپنا پیٹ کاٹ کر اسے ٹیکس کیوں دیں اور کیوں کچھ لوگوں کو اقتدار میں پہنچائیں؟

ایک مہذب ریاست میں عام شہریوں کے حوالے سے حکومت پر تین کاموں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک امن وامان، دوسرا روزگار اور بنیادی ضروریات کی فراہمی اور تیسرے بنیادی تعلیم۔ ہمارے ہاں حکومت ان تینوں ذمہ داریوں سے خود کو فارغ سمجھتی ہے۔ایسے میں ایدھی صاحب کا وجود اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت تھا۔خاص کر سندھ کے اس صوبے کے لیے جہاں شہری آبادی کا تناسب ملک میں سب سے زیادہ اور شہری آبادی کے حالات اتنے ہی خراب ہیں۔

اس خرابی کی ذمہ داری کسی اور کی نہیں اسی صوبے کے عوام کی ہے۔ یہاں کے دو نسلی گروپوں یعنی سندھیوں اور مہاجروں نے طے کر رکھا ہے کہ کچھ بھی ہو وہ اپنے لسانی تعصّبات سے اوپر نہیں اٹھیں گے۔جس کے بعد ان کی لیڈر شپ مطمئن ہے کہ وہ کچھ بھی کرلیں عوام نے کسی اور کو ووٹ نہیں دینا۔ یوں عوام کی حالت ہر گزرتے دن کے ساتھ خراب سے خراب تر ہوتی چلی جارہی ہے۔

عوام الناس کے یہی وہ خراب حالات ہیں جن میں ایدھی صاحب جیسے لوگوں کا دم بہت غنیمت تھا۔ان کی شکل میں معاشرے کے غریب غربا کے پاس ایک امید تھی اور ان کی ذات میں سماجی کام کرنے والوں کے لیے ایک رول ماڈل تھا۔ایدھی صاحب چلے گئے لیکن وہ اپنے پیچھے وہ امید اور وہ رول ماڈل چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ایک مشعل راہ بنا رہے گا۔

عہد الست

قرآن مجید کی سورہ اعراف آیت 171 سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی زندگی سے قبل تمام انسانوں کو ایک ساتھ پیدا کیا اور ان کو اپنے رب ہونے پر گواہ بنایا۔قرآن مجید کا اسلوب بالکل واضح ہے کہ یہ ایک حقیقی واقعہ تھا کوئی تمثیلی پیرایہ بیان نہیں۔آیت کا آغاز ہی ''واذ'' کے الفاظ سے ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کہ ''اور یاد کرو جب''۔قرآن مجید میں یہ الفاظ جگہ جگہ تاریخی واقعات کے بیان ہی میں استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ اگلی آیت میں قرآن مجید اس واقعہ کو بطور حجت بیان کرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم قیامت کے دن یہ کہو کہ ہم اس سے غافل تھے یا یہ کہ شرک تو ہمارے آباؤ اجداد نے کیا اور ہم اپنے پیدائشی حالات کی بنا پر شرک کا شکار ہو گئے۔

گویا قرآن مجید یہاں اس عذر کی نفی کر رہا ہے جو کوئی انسان حالات کے جبر کا شکار ہو کر اللہ کی بارگاہ میں پیش کرسکتا ہے۔یعنی لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ گرچہ خدا کے رسول نے ہمیں واضح عقلی دلائل کی شکل میں توحید کی دعوت دی تھی، مگر چونکہ شرک ہمارے آبائی ماحول کی بنا پر ہماری فطرت کا حصہ بن چکا تھا، اس لیے ہم نے توحید کی اس دعوت کو قبول نہیں کیا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ بتا رہے ہیں کہ تمھاری فطرت میں توحید کا پیغام بھی اِسی قوت کے ساتھ موجود تھا۔ جو تم نے ایک عہد کی شکل میں خود پورے شعور کے ساتھ قبول کیا تھا۔اس لیے تمھارے پاس خارج کی دعوت حق کو رد کرنے کا کوئی عذر نہیں ہے۔

اس کے بعد جو بات کہی جاسکتی ہے کہ کسی کو یہ واقعہ یاد ہی نہیں تو یہ حجت کیسے بن سکتا ہے؟ تاہم یہ اعتراض غیر متعلق ہے۔ یہاں ماضی کا کوئی یاد رہ جانے والا واقعہ زیر بحث نہیں بلکہ وہ واقعات زیر بحث ہیں جن سے انسان کے لاشعور کی تشکیل ہوتی ہے۔دور جدید میں علم نفسیات

نے اس چیز کو بہت نمایاں کر دیا ہے کہ انسان کے مزاج وطبیعت کی تشکیل میں ایک بہت اہم عامل ماضی کے وہ واقعات ہیں جو انسان کو یاد نہیں رہتے۔ یعنی اس کی زندگی کے بالکل ابتدائی چند سال۔ کسی انسان کو یاد نہیں رہتا کہ شروع کے تین چار برسوں میں اس کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے تھے۔ مگر اس کا مزاج انہی واقعات کا مرہون منت ہوتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ اس خاص واقعہ کا ہے۔ اسے انسانی یادداشت سے مٹا دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اگر اللہ کے حضور پیش ہو کر ایک اقرار کرنے کا واقعہ یاد رہتا تو پھر امتحان ختم ہو جاتا۔ تاہم اس واقعے نے انسانی فطرت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اسی کی بنا پر ہر انسان کے اندر ایک برتر ہستی، ایک خالق، ایک رب کی طلب رہتی ہے۔ اسے خدا کے تصور سے اپنے اندر کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ شیطان یہ کرتا ہے کہ اس فطری پیاس کے جواب میں اسے توحید کے ماءِ مصفا کے بجائے شرک کی غیر فطری شراب پلا دیتا ہے۔ مگر اس سے اس کی فطری پیاس نہیں بجھتی۔ انسان متعصب نہ ہو تو توحید کی دعوت کو اپنے دل کی صدا سمجھ کر قبول کرتا ہے۔

دور جدید میں ایک دوسرے پہلو سے یہ چیز نمایاں ہوئی ہے۔ انیسویں صدی میں مسیحی انتہا پسندی کے جواب میں مغرب میں رد مذہب کی تحریک پیدا ہوئی اور آخر کار خدا کا انکار کر دیا گیا۔ کمیونزم کا ایک پورا فلسفہ وجود میں آیا جس نے بالجبر مذہب کو انفرادی زندگی سے بھی نکالنے کی کوشش کی۔ مگر دو صدیوں کی تمام کوششوں کے بعد بھی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انسان خدا کے بغیر نہیں جی سکتا۔ ان دو صدیوں میں یہ انسان کی اندرونی فطرت تھی جو عہد الست سے پیدا ہوئی تھی اور جس نے الحاد کے جبر کا پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ عہد الست اگر کوئی تمثیل ہوتا تو فطرت سے محو ہو جاتا۔ مگر یہ واقعہ ایک حقیقت تھی اس لیے نہیں مٹ سکا۔ خدا کو ختم کرنے کا دعویٰ کرنے والے ختم ہو گئے۔ خدا ختم نہیں ہوا۔ وہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ عہد الست اسی حقیقت کا بیان ہے۔

وجود خداوندی پر ایک دلیل

فلسفے کی ایک شاخ Ontology ہے۔ اس میں حقیقت، وجوداور ذات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ خدا کی ذات کے ہونے پر فلسفیوں نے جو دلائل دیے ہیں ان میں سے ایک دلیل فلسفے کی اسی شاخ کی بنیاد پر دی گئی ہے۔ اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کا ہر ماننے والا اور ہر منکر چونکہ خدا کی ہستی کا تصور کرسکتا ہے، جو سب سے بلند واعلیٰ ہے، چنانچہ یہ تصور ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خارج میں بھی موجود ہے۔

یہ دلیل پہلی دفعہ گیارہویں صدی عیسویں میں مسیحی علم الکلام کے ایک بہت بڑے عالم اور فلسفی سینٹ انسلم نے پیش کی تھی۔ اس کے بعد سترہویں صدی میں جدید مغربی فلسفے کے بانی رینے ڈیکارٹ نے اس دلیل کو مزید آگے بڑھایا اور واضح کیا کہ جب ذہن خدا کی ہستی کا تصور کرسکتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ موجود ہے۔ تاہم مجموعی طور پر فلسفیوں نے اس دلیل کو رد کیا ہے جن میں ہیوم اور کانٹ جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ اس دلیل کو رد کرنے کی وجوہات بالکل سادہ ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ تصور تو کسی بھی چیز کا کیا جاسکتا ہے۔ تو کیا صرف تصور ذہن میں آنے سے خارج میں بھی کسی چیز کا ہونا لازمی ہوجاتا ہے۔ یعنی آپ کا اپنے بینک اکاؤنٹ میں لاکھ روپے کا تصور کرنے سے اس میں لاکھ روپے نہیں آجائیں گے۔ اس پس منظر میں یہ اعتراض بالکل درست ہے اور یہ دلیل ناقابل قبول ہے۔

تاہم اس فلسفیانہ بحث سے قطع نظر اس عاجز نے دلائل قرآن مجید پر اب تک جو تحقیق کی ہے اس کی روشنی میں خیال ہے کہ سینٹ انسلم نے درحقیقت یہ نکتہ قرآن مجید کی ایک دلیل سے لیا تھا، مگر اسے زیادہ بہتر طریقے پر پیش نہیں کرسکے۔ سورہ اعراف کی آیت 172 میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں آنے سے قبل اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا اور ان کو اپنے حضور جمع

کر کے ان سے اپنے رب ہونے کا عہد لیا۔ اس کے بعد قرآن بیان کرتا ہے کہ اسی عہد کی بنیاد پر قیامت کے دن انسانوں کے لیے لاعلمی اور ماحول کا اثر کوئی عذر نہیں بن سکے گا۔

اس آیت سے جو بات واضح ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا وجود انسانوں کی فطرت میں ہے۔ کوئی خارجی قرینہ نہ ہو تب بھی ایک خالق و مالک کا تصور فطرت انسانی کی پکار ہے۔ اس کے برعکس کسی خدا کا نہ ہونا یا بہت سی ہستیوں کا خدا ہونا انسانی فطرت کے لیے ایک اجنبی چیز ہے۔ چنانچہ خارجی تصورات سے بلند ہو کر داخلی تصور کی بنیاد پر انسانی فطرت کو ایک خدا، کئی خدا یا خدا کے نہ ہونے میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہو گا تو ایک خدا کا تصور اس کا فطری انتخاب ہو گا۔

یعنی بات یہ نہیں ہے کہ انسانی ذہن کسی چیز کا تصور کر سکتا ہے یا نہیں، اور جواب یہ دیا جائے کہ تصور تو کسی بھی چیز کا کیا جا سکتا ہے۔ اہم اور اصل بات یہ ہے کہ ایک خدا کا تصور اور اس کی ہستی سرتاسر ایک داخلی تصور ہے جو خارج سے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ خدا کی ضرورت اور اس کا تصور انسان کے اندر سے جنم لیتا ہے۔ یہ انسانوں کے لیے کسی پہلو سے کوئی اجنبی چیز نہیں۔ اسی بنا پر یہ ہر دور میں انسانیت کی مشترکہ میراث رہا ہے۔ اور انسانوں نے ہمیشہ اس تصور کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کیا ہے۔

کسی وجہ سے اگر انسانیت یہ تصور کبھی گم کر بیٹھے یا اس میں ملاوٹ کر دے، تب بھی انسان جیسے ہی سخت مشکلات میں گھرتے اور اپنے تعصّبات سے بلند ہوتے ہیں، وہ فوراً ایک خدا کے تصور کی طرف لپکتے ہیں۔ وہ چاہے خدا کا انکار کریں، مگر یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ خدا کا تصور ان کے داخل کے لیے ایک اجنبی تصور ہے۔ ہر انسان اپنی فطرت میں ایک خدا کے تصور سے مانوس ہے۔ چاہے وہ اس کا کتنا ہی انکار کر دے۔ یہی خدا کے ہونے کا وہ ثبوت ہے جو خود انسانوں کے اندر موجود ہے۔ فلسفیوں نے غلط طور پر اسے وجودی دلیل یا انٹالوجیکل آرگومنٹ کہا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ فطرت کی دلیل ہے۔

ہاں خدا کے اس تصور کو بعض لوگ نہیں مانتے، مگر اس وجہ سے نہیں کہ یہ ان کی فطرت کے لیے نا قابل قبول ہے بلکہ ان کے انکار کا ایک سبب یہ ہے کہ خدا کے نام پر جو مشرکانہ اوہام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ انسانی عقل اور فطرت دونوں کے لیے نا قابل قبول ہیں۔ چنانچہ انسان باطل کو رد کرتے کرتے حق کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک دوسرا اہم سبب یہ ہے کہ انسان خدا کی ذات اور اس کے تصور سے دو اور چیزوں کی توقع رکھتا ہے جو اس دنیا میں امتحان کی وجہ سے پوری نہیں کی جاسکتیں۔ ان دو چیزوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے پھر ساری گمراہی پیدا ہوتی ہے۔

پہلی یہ کہ خدا کے تصور کے ساتھ انسان فطری طور پر اسے دیکھنے کے خواہاں بھی ہیں۔ اور دوسری یہ ہے کہ انسان خدا کو خدا کی حیثیت میں جانتا ہے۔ وہ خدا جو خبیر ہے، بصیر ہے، عادل اور رحیم ہے۔ اس کا یہ تقاضہ ہے کہ خدا اس دنیا کے معاملات میں فوراً مداخلت کر کے غلط چیزوں کو ٹھیک کرے۔ یہ دونوں مطالبات فطرت بالکل ٹھیک ہیں۔ مگر جیسا کہ بیان ہوا کہ یہ دونوں چیزیں حالت امتحان کی وجہ سے پوری نہیں کی جاسکتیں۔ اگر انسانوں کے یہ دونوں فطری تقاضے بھی پورے کر دیے جائیں تو پھر امتحان ختم ہو جائے گا۔ پھر اس بات کا فیصلہ نہیں ہو سکے گا کہ غیب میں رہ کر خدا کا وفادار کون بنتا ہے۔ چنانچہ خدا ان دونوں مطالبات کے جواب میں یہ بتاتا ہے کہ ان کی تکمیل آخرت کی زندگی میں ہوگی۔

یہ بھی خیال رہے کہ یہ امتحان برپا کرنا بھی معاذ اللہ کوئی خدا کی کمزوری یا اس کا عجز نہیں کہ اسے امتحان کے بغیر پتہ نہیں چل سکتا کہ اس کا وفادار کون ہے اور کون خواہش، مفاد اور تعصب کا بندہ۔ وہ اپنے علم کی بنیاد پر یہ چیز اچھی طرح جانتا ہے۔ اسی نے جبرائیل کو جبرائیل بنایا ہے۔ اس نے میکائیل کو میکائیل بنایا ہے۔ اسی طرح وہ کسی امتحان کے بغیر ہی نبی کو نبی، صدیق کو صدیق،

محسن کو محسن اور صالح کو صالح بنا کر جنت میں بھیج سکتا تھا۔

مگر عہد الست کے بعد اس دنیا کے امتحان کو برپا کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ خود انسانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو کہ کسی کو جنت میں اعلیٰ مقام دیا گیا تو کیوں دیا گیا۔ کوئی پیچھے رہا تو کیوں پیچھے رہا اور کوئی جہنم میں گرا تو کیوں گرا۔ ظاہر ہے کہ جب امتحان برپا ہوتا ہے تو ہر انسان دیکھ لیتا ہے کہ کون ہے جس نے زیادہ قربانی دی۔ کون ہے جس نے نیکی کی زندگی اختیار کی۔ کون ہے جس نے خواہش، تعصب، مفاد، فرقہ واریت اور گروہی عصبیت سے اوپر اٹھ کر حق کا ساتھ دیا۔

چنانچہ عہد الست کے بعد اسی مقصد کے لیے یہ دنیا بنائی گئی۔ پھر اسی مقصد کے لیے روزِ قیامت برپا کیا جائے گا اور ہر شخص کو بتا دیا جائے گا کہ اس نے کیا کیا اور دوسرے بھی جان لیں گے کہ کسی کے ساتھ جو کچھ ہوا تو اس کی وجہ کیا تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا کا تصور ہماری فطرت میں ہے۔ یہ قرآن کا آرگومنٹ ہے۔ سینٹ انسلم نے شاید قرآن کی بات سنی ہوگی، مگر پوری طرح سمجھے بغیر اسے ایک دلیل بنا کر پیش کر دیا جس کے بعد سے ہزار برس سے سارے فلسفی اس کی تائید اور تردید میں لگے ہوئے ہیں۔

مدینہ کا انتقام

مدینہ پاک پر حملہ، سرکارِ دو عالم کے شہر پر حملہ، جس نے انسانیت کو امن دیا اس کریم کے گھر پر حملہ...... یہ وہ احساس ہے جو رات سے مجھے بے چین کیے ہوئے ہے۔ اتنی تکلیف تو پاکستان میں مارے جانے والے ہزار ہا لوگوں کی شہادت پر نہیں ہوئی جتنی تکلیف یثرب کی حرمت کے پامال ہونے پر ہوئی ہے۔ بے گناہ کی جان تو سب جگہ یکساں محترم ہے، لیکن مدینہ تو شہرِ رحمت ہے۔ وہاں کی بے حرمتی کیسے برداشت ہو؟ لیکن اب یہ ہو گیا ہے تو پھر اس کے کچھ نتائج نکلیں گے جو ہم میں سے کسی کے حق میں اچھے نہیں ہوں گے۔ آنے والی تباہی سے ہمیں بچنا ہے تو ہمیں ذرا رک کر پوری بات سمجھنا اور ایک مضبوط فیصلہ کرنا ہو گا۔

سرکار دو عالم رسالتماب کے بعد نبوت ختم کر کے امت مسلمہ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ اب تمھارے ذریعے سے دنیا کو حق کی شہادت ملے گی۔ جب تک تم ایمان و اخلاق کا علم تھامے رہو گے، دنیا میں عزت و سرفرازی تمہارا مقدر ہے۔ جب تک غیر مسلموں کو دعوتِ دین دیتے رہو گے خدا کی رحمت تمھارے شاملِ حال رہے گی۔ اس کے برعکس کرو گے تو ذلت اور بربادی مقدر کر دی جائے گی۔

یہی قانون تھا۔ چار ہزار سال سے یہی قانون چلا آ رہا ہے۔ داؤد و سلیمان علیھما السلام کی عظمتیں ہوں یا خلافت راشدہ کی رفعتیں، بخت نصر اور ٹائٹس رومی کا عذاب ہو یا چنگیز اور ہلاکو کا قہر، سب اسی قانون کا اطلاق ہے۔ مسلمانوں نے اس قانون کی خلاف ورزی کا پہلا ذائقہ تاتاریوں کے عذاب کی شکل میں چکھا۔ دوسرا موقع دو سو برس قبل اس وقت آیا جب پورا عالم اسلام ایمان و اخلاق کی آخری پستی کو چھونے لگا تھا۔ چنانچہ قانون پھر حرکت میں آیا۔ اس دفعہ مغربی اقوام کو بطور عذاب مسلمانوں پر مسلط کر دیا گیا۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں مسلمانوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ پہلی دفعہ عذاب آنے پر مسلمانوں نے دعوت کا راستہ اختیار کرلیا تھا۔ جس کے بعد ان کا عروج ان کو لوٹا دیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے اس دفعہ شیطان نے مسلمانوں میں غیر مسلموں کی شدید نفرت پیدا کردی۔ جو عذاب الٰہی تھا اس کو غیروں کی سازش کے خانے میں ڈال دیا اور اپنی اصلاح کی سوچ کے بجائے دوسروں کی عداوت کو عام کردیا۔ بدقسمتی سے دوسو برس سے شیطان مسلمانوں میں نفرت کا یہی ذہن عام کیے ہوئے ہے۔ جو شخص توبہ کی منادی کرتا اور صحیح بات بتانے کی کوشش کرتا ہے اس کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو انبیائے بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا تھا۔ یعنی بعض کو قتل کردیا گیا اور بعض کو جھٹلا دیا گیا۔

مدینہ پر کچھ خودکش حملہ آوروں نے نہیں، نفرت پر مبنی اسی سوچ نے حملہ کیا ہے۔ اس سوچ کے پرستار ہمارے اندر ہر جگہ موجود ہیں۔ ٹی وی پروگراموں، اخباری کالموں، فیس بک دیواروں، دینی محفلوں غرض ہر جگہ یہ لوگ اپنی نفرت کا زہر پھیلا رہے ہیں۔ ان لوگوں کی موجودگی میں آپ ایسے ناپاک حملوں کی جتنی مذمت کریں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ان کی نفرت کا زہر اس ملک اور پورے عالم اسلام میں ہزار ہا انتہا پسند اور دہشت گرد پیدا کرتا رہے گا۔

ہم نے ان کو اسی طرح نفرت پھیلانے دی تو یاد رکھیے! خدا کا قانون غیر متبدل ہے۔ یہ مذہب کی آڑ میں شیطان کا سودا بیچ رہے ہیں۔ ہم ان کا سودا اگر ایسے ہی خریدتے رہے تو یہ خود بھی مارے جائیں گے اور باقی قوم کو بھی مروائیں گے۔ اس سے پہلے کہ خداوندِ دو عالم مدینہ کا انتقام لینا شروع کرے، ہمیں طے کرنا ہوگا کہ ہمیں ان لوگوں سے جان چھڑانی ہے۔ ورنہ یاد رکھیے خدا کا غضب ہم میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑے گا۔

ہماری نجات نفرت میں نہیں ایمان و اخلاق اور دعوت کو اپنی زندگی بنانے میں ہے۔ اسی کو

چھوڑنے کی بنا پر ہم دوسو برس سے عالم سزا میں ہیں اور ہماری کوئی بھی کوشش ہمیں غیر مسلموں کے تسلط سے نہیں نکال سکی۔لیکن اگر ہم ایمان واخلاق اور دعوت کے اس راستے کو اختیار کر لیں تو ہمارا عروج بمشکل بیس برس کی بات ہے۔اب فیصلہ ہمیں کرنا ہے۔اپنے رب کی بات مانیں گے تو عروج ہمارا مقدر ہے۔شیطان کی راہ پر چل کر نفرت کو اختیار کریں گے تو تباہی ہمارا مقدر ہے۔مدینہ کا انتقام تو لیا جائے گا۔نفرت کے پجاریوں کو اس کی قیمت دینا ہوگی۔اب ہمیں اپنے آپ کو اس عذاب سے بچانا ہے۔

(نوٹ اس مضمون میں سزا و جزا کے جس قانون کو بیان کیا گیا ہے، قرآن، سیرت اور تاریخ کی روشنی میں اس کی تفصیل ابو یحییٰ صاحب کی دو کتابوں ''آخری جنگ'' اور عروج و زوال کا قانون اور پاکستان'' میں موجود ہے۔)

ابویحییٰ

اعضاء کی پیوندکاری اوراسلام

اعضا کی پیوندکاری

پچھلے دنوں عالمی شہرت کے حامل معروف سماجی کارکن عبدالستار ایدھی صاحب کا انتقال ہوگیا۔اپنے انتقال سے قبل وہ اپنے اعضاءعطیہ کرنے کی وصیت کر گئے تھے۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعدان کی آنکھوں کا قرنیہ(Cornea)دوضرورت مندوں کولگادیا گیااوران کی بینائی بحال ہوگئی۔تاہم ان کےاس عمل سے ہمارے ہاں ایک پرانی بحث پھرزندہ ہوگئی۔یعنی کیا اعضاءکوعطیہ کرنا جائز ہے۔ہمارے ہاں اس معاملے میں اہل علم کی دوآراء ہیں۔ایک وہ ہیں جو اسے ناجائز کہتے ہیں اوردوسرےاس کے جواز کےقائل ہیں۔

آج کےاس مضمون میں ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ ہم اس معاملے میں دونوں طرف کے دلائل قارئین کے سامنے رکھ دیں۔فیصلہ کرنا خود قارئین کا کام ہے کہ کون سا نقطہ نظر درست ہے۔

ایک اخلاقی مسئلہ

تاہم علمی دلائل سے قطع نظراس معاملے میں دوچیزیں ایسی ہیں جن کا سمجھنا لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ایک یہ کہ اعضا کی پیوندکاری کا معاملہ قرآن وسنت میں زیر بحث نہیں آیا۔آ بھی نہیں سکتا تھا۔اس لیے کہ یہ عمل دورجدید میں میڈیکل سائنس کے شعبے میں زبردست ترقی کے بعدہی ممکن ہوا ہے۔اس لیےقرآن وحدیث میں اس حوالے سے براہ راست کوئی نص موجود نہیں ہے۔چنانچہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔

دوسری حقیقت جس کا سمجھنا زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح کے اجتہادی مسائل حق و باطل کا معاملہ نہیں ہوا کرتے۔ اہل علم سائل کے جواب میں دیانت داری سے تحقیق کر کے اپنی آراء بیان کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد متعلقہ لوگوں کا مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ کس عالم کی رائے سے مطمئن ہیں۔ وہ دلائل کی بنا پر جس رائے کو چاہیں اختیار کر لیں۔ یہ ان کا اور ان کے پروردگار کا معاملہ ہے۔ انھوں نے کسی نقطہ نظر کو غلط سمجھنے کے باوجود صرف اس لیے اختیار کیا کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق تھا تو وہ اللہ کے ہاں جوابدہ ہوں گے۔

لیکن وہ دیانت داری سے مطمئن ہونے کے بعد کسی رائے کو اختیار کرتے ہیں تو ان کو کسی وعید کا مستحق نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ چیز بیان کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے ہاں یہ عام رویہ ہے کہ اجتہادی مسائل میں فتویٰ دینے کے بعد بعض اہل علم اس سے اختلاف کرنے والوں کی نہ صرف نیت پر شک کرتے ہیں بلکہ ان کو مغرب سے مرعوب، اسلام سے منحرف اور انھی جیسے دیگر خطابات سے نوازتے ہیں۔ اسی پیوند کاری کے معاملے میں معلوم ہے کہ مختلف رائے رکھنے والوں کو حیات بعد از ممات کا منکر قرار دیا گیا۔ یہ ایک سنگین اخلاقی مسئلہ ہے۔ قران مجید اس طرح کی وعیدیں صرف انھی لوگوں کو سناتا ہے جو ایمان کے منکر یا کسی اخلاقی جرم کے مسلسل مرتکب ہوں۔ اجتہادی معاملات میں مختلف آراء رکھنے والوں کے بارے میں اس طرح کی رائے رکھنے والے خود اللہ کے ہاں جواب دہی کے مقام پر آ جاتے ہیں۔

ہمارے نزدیک ایسے اجتہادی معاملات کو نہ دعوت کا موضوع بننا چاہیے نہ نزاع کا۔ دونوں طرف کے دلائل لوگوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ ان پر چھوڑ دینا چاہیے۔ لوگ پوچھیں تو اپنی رائے بھی بیان کر دینا چاہیے۔ لیکن ہر رائے کا احترام کرنا چاہیے اور لوگوں کو حق دینا چاہیے کہ جس رائے کو چاہیں اختیار کر لیں۔

جواز کے قائلین اور مخالفین

اس اصولی بحث کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ اس معاملے میں اہل علم کی آراء کیا ہیں۔ جو لوگ اعضاء کی پیوندکاری کے قائل ہیں، ان کے استدلال کی بنیاد دو چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک شخص اپنی موت کے بعد اپنے اعضاء کسی ضرورت مند کو لگا دینے کی وصیت کرتا ہے تو اس کے خلاف دین کی کسی نص میں حرمت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ عمل اپنی ذات میں انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ بہت سے حالات میں تو یہ دوسروں کی زندگی بچانے کا سبب بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک جائز عمل ہے اور کوئی دینی یا اخلاقی پہلو اس میں مانع نہیں۔

اس رائے کے مخالفین دوسری بات سے تو اختلاف نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں کہ یہ عمل دوسروں کے لیے ایک نفع بخش عمل ہے، مگر جہاں تک دینی نصوص کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک دین کے کئی نصوص اس کے جواز کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور ان سے بالواسطہ طور پر اعضاء کی پیوندکاری کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ یہ درج ذیل ہیں۔

مخالفین کے دلائل

اعضاء کی پیوندکاری کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ مرنے والے کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ ہمارے دین میں مرنے والوں کا مُثلہ کرنا یعنی لاش کی بے حرمتی کرنا جیسے ہند نے سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کے جسم کی بے حرمتی کی تھی، ایک فعل حرام ہے۔ اعضاء کی پیوندکاری میں بھی مرنے والے کے جسم کا مثلہ کیا جاتا ہے۔ اس کے جسم کو کاٹ پیٹ کر اعضاء کو نکالا جاتا ہے۔ اس عمل کے بغیر دوسروں کو اعضا نہیں لگائے جا سکتے۔ چنانچہ اعضاء کی پیوندکاری بغیر مثلہ کیے ممکن نہیں جو کہ فعل حرام ہے۔ اس لیے یہ ناجائز ہے۔

دوسری دلیل جو اسی سے پھوٹتی ہے کہ اگر اسی طرح لوگوں کے اعضاء کاٹ کر نکالے جاتے

رہے تو مرنے کے بعد دفن کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں بچے گا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ ہمارے اعضاء ہماری ملکیت ہی نہیں ہیں۔ ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم ان میں کسی قسم کا تصرف کریں۔ خودکشی کرنا اسی لیے حرام ہے۔ اپنے ہاتھ اور پاؤں کاٹنا یا جسم کو کسی اور طرح کا نقصان پہنچان اسی اصول پر ناجائز ہے۔ ایک فعل جب زندگی میں حرام ہے تو مرنے کے بعد بھی حرام ہے۔ چنانچہ اسی اصول پر مرنے کے بعد اعضاء عطیہ کرنے کی وصیت نہیں کی جاسکتی ہے۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ مرنے والے کے جسم کو کسی بھی قسم کی اذیت دینا اسے زندگی میں اذیت دینے کے مترادف ہے۔ مرنے والے کے جسم کے ساتھ چیر پھاڑ کرنا اور اعضا کو کاٹ کر نکالنا ایسا ہی ہے جیسے زندہ کے جسم سے اعضا کو کاٹ کر نکالا جائے۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ انسان موت کے ساتھ مرتے نہیں ہیں بلکہ روز قیامت دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ ایسے میں اگر کسی نے اپنے اعضا عطیہ کردیے ہوں گے مثال کے طور پر آنکھیں تو روز قیامت اس کی اپنی آنکھیں موجود نہیں ہوں گی اور نتیجے کے طور پر وہ اندھا رہ جائے گا اور آخرت کی زندگی میں ہمیشہ اندھا رہے گا۔

چھٹی دلیل جو اسی سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ پھر عذاب وثواب میں قیامت کے دن بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک شخص کی آنکھیں اگر دوسرے کو لگا دی گئیں تو عطیہ دینے والے نے اپنے آنکھوں سے جتنے گناہ کیے ہوں گے جیسے بدنگاہی وغیرہ تو اس کا نتیجہ عطیہ قبول کرنے والے کو بھگتنا ہوگا۔

ساتویں دلیل یہ ہے کہ اعضا کے پیوندکاری کے حق میں کوئی نص موجود نہیں۔ جتنے دلائل ہیں وہ عقلی ہیں۔ عقل کو حاکم سمجھنا معتزلہ جیسے گمراہ فرقوں کا کام ہے۔

جوابی دلائل

یہ اس فقیر کی ناقص معلومات کی حد تک ان دلائل کا خلاصہ ہے جو اس عمل کے مخالفین پیش کرتے ہیں۔تاہم جواز کے قائلین ان تمام دلائل کا جواب دیتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

پہلی دلیل یعنی مُثلہ یا لاش کی بے حرمتی کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق انسان کی نیت سے ہے۔جو لوگ مثلہ کرتے ہیں وہ نفرت اور انتقام کی آگ سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کا اصل مقصد اپنے غصے کو ٹھنڈا کرنا اور لاش کی توہین کرنا ہی ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ اعضاء کی پیوندکاری کرنے والے ڈاکٹر کا نظریہ بالکل جدا ہوتا ہے۔اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ڈاکٹر کسی انسان کی زندگی میں آپریشن کرتا ہے تو اس کے پیش نظر مریض کو اذیت دینا نہیں ہوتا۔گرچہ بظاہر اس میں اذیت کا پہلو ہوتا ہے۔ٹھیک اسی طرح مرنے والے کے اعضا کو کسی کی زندگی بچانے کے لیے نکالنا مُثلہ نہیں بلکہ ایک خدمت ہے۔یہی تمام متعلقہ لوگوں کی نیت ہوتی ہے۔ اس میں بے حرمتی کا کوئی سوال نہیں۔اور دین میں اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔

دوسری دلیل یعنی مرنے کے بعد دفن کرنے کے لیے کچھ نہیں بچے گا کا سوال ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اپنے مردے کو دفنانے کے پابند ہیں، لازمی پورا جسم دفنایا جائے اس کی پابندی دین نے نہیں لگائی۔ جنگ میں جب ایک فوجی اللہ کے لیے لڑنے جاتا ہے تو بارہا اس کے کئی اعضاء تلف ہو جاتے ہیں اور کبھی جسم کا بیشتر حصہ گولہ باری کی نذر ہو جاتا ہے۔شہادت کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ دفنا دیا جاتا ہے۔اسی اصول پر اس معاملہ کو دیکھنا چاہیے۔

تیسری دلیل یعنی اعضاء ملکِ رب ہیں اور ان میں تصرف جائز نہیں کا جواب یہ ہے کہ انسان کی جان بے شک اللہ کی ملک ہے،مگر میدان جنگ میں ایک مجاہد اسی جان کا اور اپنے اعضا کا نقصان اللہ کی رضا کے لیے گوارا کر لیتا ہے۔یہ دین میں سب سے بڑی نیکی سمجھی جاتی ہے۔

اسی طرح کسی کی جان بچانے کے لیے غیور اور بہادر لوگ اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔ کوئی نہیں کہتا ہے کہ انھوں نے غلط کیا بلکہ اس عمل کو عظیم ایثار اور قربانی سمجھا جاتا ہے۔ اسی پر اعضا کو بعد از مرگ عطیہ کرنے کو قیاس کرنا چاہیے۔ مرنے والے بلا وجہ اپنے اعضا ضائع نہیں کرتے نہ خو کو کوئی نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ ان کے سامنے بھی ایک برتر مقصد ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اللہ کی ملک میں تصرف نہیں بلکہ خدمت کا وہ عمل ہے جو محمود ہے۔

چوتھی دلیل یہ کہ یہ مرنے والے کو اذیت دینے کے مترادف ہے تو یہ استدلال بعض روایات کے سوئے فہم سے پیدا ہوا ہے۔ ان روایات میں اصل حکم میت اور قبر کے احترام کا ہے۔ جن لوگوں نے زندگی میں کبھی کسی مردہ جسم کو غسل اور تدفین کے وقت سنبھالا ہے وہ جانتے ہیں کہ ذرا سی بے احتیاطی سے مردہ جسم زمین پر آ گرتا ہے۔ اس سے مردہ کے لواحقین کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی معاملے میں لوگوں کو حساس بنانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردہ کو زندہ سے تشبیہ دے کر سمجھایا ہے کہ مردے کو اذیت دینا گویا کہ زندہ کو اذیت دینے کے مترادف ہے۔ ورنہ معلوم بات ہے کہ موت کے ایک دو دن کے اندر خود فطرت کا قانون جو کچھ مردہ جسم کے ساتھ کرتا ہے وہ اگر کسی زندگی کے ساتھ ہو تو وہ اذیت کی آخری انتہا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کسی مومن کو یہ تکلیف دینا گوارا کریں گے؟ ہرگز نہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ مومن کے جسم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اصل وجود تو پہلے ہی رخصت ہو چکا ہے اور اب معاملہ صرف جسم کے ساتھ ہو رہا ہوتا ہے۔ یہی اصول پیوند کاری کے لیے نکالے گئے اعضا پر منطبق ہوتا ہے۔ اصل ہستی کو تو فرشتے موت کے وقت ساتھ لے جاتے ہیں۔ پیچھے جسم بچتا ہے جس نے بہر حال گلنا سڑنا ہی ہے۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ مرنے والا اگر اپنے اعضا عطیہ کر گیا تو روز قیامت وہ ان اعضاء

سے محروم ہوگا۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تصور آخرت کی زندگی کے غلط فہم پر مبنی ہے۔آخرت کے احوال تفصیل کے ساتھ قرآن وحدیث میں بیان ہوئے ہیں۔ان بیانات سے صاف واضح ہے کہ انسان کی شخصیت تو یہی ہوگی جو اس دنیا میں ہے،مگر اس کے جسم کی نوعیت بالکل مختلف ہوگی۔ سب کو معلوم ہے کہ وہاں کا جسم مرنے کے لیے نہیں بنا ہوگا۔اس جسم میں انحطاط بھی نہیں ہوگا۔ اہل جنت کے جسم کی تفصیل تو ویسے بھی جو کچھ بیان ہوتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نوعیت کا حیوانی جسم نہیں ہوگا جیسا کہ خون اور دیگر غلاظتوں پر مشتمل آج ہمارا جسم ہوتا ہے۔ بلکہ انسان کو ایک نیا قالب دیا جائے گا جو کہ انسان کے اعمال کے حساب سے تیار کیا جائے گا۔

مزید براں یہ کہ ایک شخص راہ خدا میں جنگ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ پیر یا آنکھ گنوا بیٹھے تو کیا وہ بھی لنگڑا لولا اور اندھا اٹھایا جائے گا؟ اس سے بھی کہا جائے گا کہ تم تو اپنے اعضا ضائع کر کے آگئے اس لیے تمھیں کچھ نہیں ملے گا؟ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔اس کا عمل دیکھا جائے گا۔نیت دیکھی جائے گی۔اس کے مطابق اللہ تعالیٰ ایک نیا اور مکمل قالب اسے عطا کریں گے ۔یہی آخرت کی زندگی کا اصول ہے۔

چھٹا مسئلہ عذاب وثواب کا ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ نیکی و بدی کا ارتکاب انسان کی شخصیت کرتی ہے۔اعضاو جوارح صرف ذریعہ ہوتے ہیں۔جس وقت کوئی شخص مرتا ہے تو اس کا نامہ اعمال اس کی شخصیت کے ساتھ بھیج دیا جاتا ہے اور اکاؤنٹ بند ہو جاتا ہے۔اب فرض کیجیے کہ اس کی آنکھ کسی اور کو لگ گئی ہے تو وہی اس کا ذمہ دار ہے۔

رہا عذاب وثواب تو جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ یہ تصور ہی درست نہیں ہے کہ ٹھیک یہی والی آنکھ آخرت میں لگا دی جائے گی۔قیامت کے دن دیے جانے والے اجسام اپنے ساخت اور صلاحیت دونوں کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوں گے۔مزید براں یہ کہ خود موجود دنیا کا جسم بھی

ساری عمر ایک ہی نہیں رہتا۔ ہر لمحے انسانی جسم میں نئے خلیات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور کم وبیش دس برس میں پورا جسم بدل جاتا ہے۔ گویا ساٹھ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ہماری آنکھیں چھ دفعہ بدل چکی ہوتی ہیں۔ تو کیا قیامت کے دن چھ مختلف آنکھیں لگا کر لوگوں کو سزا و جزا دی جائے گی۔

بات بالکل سادہ ہے کہ نیکی و گناہ انسانی شخصیت کرتی ہے۔ قیامت کے دن اس شخصیت کو نیا قالب دیا جائے گا۔ اسی قالب پر سزا و جزا ہوگی۔ جرم آنکھ نہیں کرتی انسان کرتا ہے۔ پاکدامنی آنکھ نہیں اختیار کرتی۔ انسان کرتا ہے۔ سزا و جزا اسی انسان کو ملے گی۔ اور اس سزا و جزا کے لیے روز قیامت اسے ایک نیا قالب دیا جائے گا۔ اس قالب کا تعلق انسان کے اعمال سے ہوگا۔ چنانچہ ایک کافر اور مجرم اِس دنیا میں بینا ہونے کے باوجود وہاں اندھا اٹھایا جائے گا اور راہ حق میں اپنے پاؤں گنوانے والا مکمل جسم کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

ساتویں اور آخری دلیل یہ کہ عقل کو حاکم سمجھنا گمراہی ہے تو بلاشبہ وحی پر عقل کو حاکم سمجھنا گمراہی ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہ کام تو کوئی نہیں کر رہا۔ اگر وحی صراحت سے یہ کہہ دے کہ یہ فعل حرام ہے تو بات ختم ہوگئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں وحی خاموش ہے۔ جب خاموش ہے تو لوگ عقل استعمال کر کے اجتہاد کرتے ہیں۔ جنھوں نے مخالفت کی ہے انھوں نے بھی عقلی استنباط کر کے اجتہاد ہی کیا ہے۔ چنانچہ اتنے ''معتزلہ'' تو وہ بھی ہو ہی گئے۔ ایسے میں وحی کی روشنی میں عقلی استنباط کر کے حمایت کرنے والے کو معتزلہ قرار دینا کیسے درست ہے؟

حرف آخر

میرے نزدیک اس معاملے میں اہم ترین بات قرآن مجید کے اپنے بیانات ہیں جن کا تعلق انسانی زندگی کی حرمت، تحفظ اور اہمیت سے ہے۔ قرآن مجید بالکل واضح ہے کہ کسی کی جان بچانا پوری انسانیت کو زندگی دینے کے مترادف ہے۔ قرآن مجید جان کو بچانے

کے لیے کلمہ کفر کہنے اور حرام تک کھانے کی جب اجازت دیتا ہے۔ جب جان بچانے کی یہ اہمیت ہے تو اس کے بعد اس مقصد کے لیے کچھ کرنا اور اسی ذیل میں کسی کی معذوری دور کرنا اعلیٰ ترین دینی اور اخلاقی عمل ہے۔ کسی کی جان بچانے کے جس مقصد کے لیے کلمہ کفر کہنے اور حرام کھانے کی اجازت ہے، اس کو حرام قرار دینے کے لیے کوئی استنباطی دلیل کافی نہیں۔ اس کے لیے صریح اور واضح نص درکار ہے جو بتاتی ہو کہ بعد از مرگ اعضا عطیہ نہیں کیے جا سکتے۔ ایسی کوئی دلیل ہمارے علم کی حد تک موجود نہیں ہے۔

تاہم اس کے باوجود ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ ہر شخص وہ نقطہ نظر رکھنے کا حق رکھتا ہے جسے وہ درست سمجھتا ہے۔ یہی اجتہادی معاملات میں درست طریقہ ہے۔

جہاں رہیے اللہ کے بندوں کے لیے باعث رحمت بن کر رہیے، باعث آزار نہ بنیے۔

سوال وجواب

ابو یحییٰ

ہدایت کے لیے عرب کا انتخاب

سوال:

میرا ایک سوال ہے برائے کرم جواب عنایت فرمائیں۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبوت کے لیے عرب معاشرے کو ہی کیوں منتخب کیا؟ ہم سنتے آئے ہیں کہ حضرت آدم کو سری لنکا کے علاقے میں اتارا گیا۔اور یہ سارا سلسلہ عرب کیسے پہنچا۔دنیا میں اور بھی سولائزیشنز تھیں۔ تہمینہ اعجاز

جواب:

حضرت آدم کے سری لنکا میں اترنے والی بات کسی مستند ماخذ میں موجود نہیں صرف ایک مشہور بات ہے۔حضرت آدم کی اولاد میں حضرت نوح بہت بڑے رسول گزرے۔ان کے تین بیٹے تھے سام، حام اور یافث ۔سام کی اولاد مشرق وسطیٰ کے علاقے میں آباد ہوئی۔ یہ لوگ سامی اقوام کہلاتے ہیں اور عرب انھی کی ایک شاخ ہیں۔انھی کے اندر حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔

جہاں تک عرب کے انتخاب کا تعلق ہے تو اصل انتخاب حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کا کیا گیا تھا۔چنانچہ پہلے ان کی اولاد کے ایک حصے یعنی بنی اسرائیل کو نبوت وامامت عالم سے سرفراز کیا گیا اور تقریباً ڈیڑھ ہزار برس تک دنیا کی ہدایت و رہنمائی ان کے ذریعے سے کی جاتی رہی۔تاہم جب ان کا بگاڑ حد سے زیادہ بڑھا اور انھوں نے حضرت عیسیٰ کا بھی انکار کر دیا تو انھیں اس منصب سے معزول کر دیا گیا۔

اس دوران میں حضرت ابراہیم کے بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیل کی اولاد عرب میں ایک قوم بن چکی تھی۔ چنانچہ ان کے درمیان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا۔23

برس کی جدوجہد کے بعد عرب معاشرے نے اسلام کو مکمل طور پر قبول کیا اور دنیا پر شہادت حق کی وہی ذمہ داری ادا کی جو اس سے قبل بنی اسرائیل ادا کرتے رہے تھے۔

چنانچہ پچھلے چار ہزار برس سے دنیا میں وہی لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کے منصب پر فائز ہیں جن کا تعلق آل ابراہیم سے ہے۔

نماز نہ پڑھنے کی سزا

سوال:

السلام علیکم

اللہ سبحانہ وتعالی نے نماز نہ پڑھنے کی کوئی سزا بیان نہیں کی جیسا کے چوری، زنا یا قتل کی سزائیں ، مجھے آج یہ سوچ آئی کہ اللہ رب العزت کی ذات اتنی عظیم ہے کہ وہ بندے کے ساتھ give and take policy نہیں اپناتا جیسا کہ عام طور پر انسانوں کے آپسی معاملات میں ہوتا ہے۔ رب نے عبادت /نماز فرض تو کر دی لیکن نہ پڑھنے پر سزا نہیں رکھی۔ ایسا نہیں کہا کہ نماز نہیں پڑھو گے تو کھانا نہیں ملے گا۔۔۔ اس کو تو عبادت کی ضرورت نہیں ہے یہ تو بندے کو شرف بخشا گیا کہ وہ اپنے رب کی عبادت کرے۔ اور سب سے بڑھ کر وہی ذات لائقِ عبادت ہے۔ ایک بندہ جب اپنے رب کے ساتھ تعلق بنا لیتا ہے تو اس کو گوارہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے رب کے سامنے نماز کے لئے کھڑا ہی نہ ہو یا اس کے سامنے اپنی پیشانی زمین پر رکھ کر خود کو عاجز ظاہر نہ کر دے۔

آپ سے پوچھنا یہ تھا کہ ایسا سوچنا کہ نماز نہ پڑھنے کی سزا نہیں ہے اور اس کی یہ وجہ ہے جو میں نے سوچی کیا یہ غلط تو نہیں۔۔۔ میرا علم بہت محدود ہے لیکن میں سارا دن اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے باتیں کرتی رہتی ہوں اس لیے ڈر رہتا ہے کہ گستاخی نہ ہو جائے، سارہ معظم

جواب:

وعلیکم السلام

دیکھیے اللہ کی نافرمانی دو پہلوؤں سے قرآن مجید میں زیر بحث آئی ہے۔ایک حیثیت میں یہ باعث گناہ ہے۔اس حیثیت میں نافرمانی کا ہر کام انسان کو آخرت میں سزا کا مستحق بنا دیتا ہے چاہے اس کی سزا بیان ہوئی ہو یا نہیں۔۔دوسرے پہلو سے اللہ کی نافرمانی کے کاموں کو گناہ کے ساتھ جرائم بھی قرار دے دیا گیا ہے۔اس پہلو سے دنیا میں ان کی کوئی سزا بھی بیان کی گئی ہے۔ جیسے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا قتل کی سزا موت اور زنا کی سو کوڑے وغیرہ۔

اس پہلو سے دیکھیں تو نماز کی کوئی متعین سزا دنیا میں بیان نہیں کی گئی ہے۔البتہ آخرت کے بارے میں قرآن بالکل واضح ہے کہ اہل جہنم کے اس سزا کے مستحق ہونے کی وجہ نماز نہ پڑھنا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''(اہل جنت مجرموں سے پوچھیں گے) تمھیں جہنم میں کیا چیز لے گئی۔وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔'' (المدثر۔آیت 42-43)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اللہ کو عبادت کی ضرورت ہے یا نہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ حقوق یا عبادات اس لیے مقرر نہیں کیے ہیں کہ بندوں کا عبادت کرنا کسی پہلو سے ان کی کوئی ضرورت ہے۔فلسفہ عبادت یہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ عبادت کر کے بندے وہ حق ادا کرتے ہیں جو ان پر ایک معبود کے حوالے سے عائد ہوتا ہے۔کوئی نماز نہیں پڑھتا تو وہ اپنے اوپر عائد ہونے والے ایک اہم بلکہ اہم ترین حق کو ادا نہیں کرتا۔سزا اس حق تلفی کی ہوگی۔ اس کی نہیں کہ اللہ کی عبادت نہیں کی۔انھیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

سوال:

تعلیم اور آخرت، قرآن فہمی

محترم ابویحییٰ صاحب

السلام علیکم

امید کرتا ہوں کہ آپ اللہ کے فضل سے ٹھیک ہوں گے۔ میں نے آپ کی کچھ کتابیں، جب زندگی شروع ہوگی سیریز اور تیسری روشنی پڑھی ہیں۔ بہت اچھی تھیں۔ بہت کچھ سیکھا۔

سر میں نمل کالج میں الیکٹریکل انجینئرنگ کا طالب علم ہوں اور آپ سے کچھ سوالات ہیں۔

۱۔ بعض اوقات میں اپنی پڑھائی پر توجہ نہیں دے پاتا کیوں کہ مجھے لگتا ہے کہ میں اپنا بہت سا وقت اس پڑھائی میں لگا رہا ہوں جس کا مجھے آخرت میں کچھ فائدہ نہیں۔ برائے کرم اس معاملے میں کچھ رہنمائی فرمائیے۔

۲۔ میں قرآن پاک کو گہرائی میں جا کر سمجھنا چاہتا ہوں۔لیکن عربی کا کچھ زیادہ علم نہیں ہے۔ برائے کرم کچھ اہم چیزوں کی طرف رہنمائی فرما دیجیے جو قرآن فہمی کے دوران پیش نظر رہنی چاہئیں۔اور قرآن پاک کو بہتر سمجھنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ محمد یوسف

جواب:

عزیز بھائی محمد یوسف

السلام علیکم

آپ کا ای میل پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔اللہ آپ کو دین و دنیا کی ترقی عطا فرمائے۔آپ کے سوالات کے جواب درج ذیل ہیں۔

۱۔ یہ تصور کہ دنیا کی تعلیم حاصل کر کے آخرت کا کوئی فائدہ نہیں، ایک ایسا تصور ہے جس کا

ہمارے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے دین کی تعلیم یہ ہے کہ تمھارا امتحان اسی دنیا میں لیا جائے گا نہ کہ ترک دنیا کی صورت میں۔ سو آپ کو تعلیم بھی حاصل کرنی ہے، شادی کرنی ہے گھر بسانا ہے ملازمت کرنی ہے اور تمام ذمہ داریاں ادا کرنی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ اللہ کو یاد رکھنا ہے۔ ہر معاملے میں اللہ کے احکام کو جاننا ہے اور اس کی مرضی کے مطابق چلنا ہے۔ سارا اجر اسی چیز کا ہے۔

۲۔ دوسرے سوال کے جواب میں عرض یہ ہے کہ پہلے مرحلے پر قرآن مجید کا اصل پیغام سمجھنے کی کوشش کیجیے یعنی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں نیز جنت اور آخرت کی کامیابی کن چیزوں پر موقوف ہے۔ خوش قسمتی سے اللہ تعالیٰ نے اس فقیر سے یہ کام بھی لے رکھا ہے۔ میری کتاب قرآن کا مطلوب انسان میں قرآن و حدیث کے حوالے سے یہ ساری تفصیل موجود ہے۔ اس کو میں نے ایک کورس کی شکل میں پڑھا بھی دیا ہے جو آپ انذار کی ویب سائٹ www.inzaar.org پر سن سکتے ہیں۔

اسے سنیے اس کے بعد پھر اسی سائٹ پر میرا خلاصہ قرآن کا پورا درس قرآن موجود ہے جو علمی طور پر بھی قرآن کا پیغام واضح کر دے گا۔ یہ سب سن لیں اس کے بعد اردو کی تین چار اہم تفاسیر کا مطالعہ کر لیں تو قرآن کی گہری سمجھ پیدا ہو جائے گی۔ ان میں اصلاحی کی تدبر قرآن، مولانا مودودی کی تفہیم القرآن اور مفتی شفیع کی معارف القرآن شامل ہیں۔ اس طرح آپ عربی سیکھے بغیر قرآن کو سمجھ لیں گے۔

بس آپ امید کی شاہراہ کو اختیار کرلیجیے
کامیابی کا ہر راستہ اسی راہ سے نکلتا ہے (ابویحییٰ)

جاوید چودھری

حسد کو اپنا دوست بنائیں

خاتون کا تعلق میانوالی کے کسی چھوٹے سے گاؤں سے تھا، وہ گرتے پڑتے تعلیم حاصل کرتی رہی تھی، اسے ایف ایس سی کے بعد لاہور کے ایک میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا، اس کی کلاس میں دو طالب علم بچپن سے ایک دوسرے کے دوست چلے آرہے تھے، آپ ان میں سے ایک کا نام مظہر سمجھ لیں اور دوسرے کا نام امجد۔ یہ دونوں بہت ذہین اور محنتی تھے اور عموماً کلاس میں پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کرتے تھے، یہ دونوں ذہانت اور محنت میں یکساں تھے لیکن شکل و صورت کے معاملے میں دونوں میں فرق تھا۔ مظہر خوبصورت اور وجیہہ شخص تھا جبکہ امجد عام نین نقش اور گندمی رنگت کا مالک تھا۔ یہ دونوں جب میڈیکل کالج پہنچے اور وہاں انہیں خواتین کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تو ان کے درمیان ایک خاموش کشمکش شروع ہوگئی، مظہر اپنی مردانہ وجاہت اور خوبصورتی کے باعث خواتین میں پاپولر ہو گیا جبکہ امجد کو خواتین گھاس نہیں ڈالتی تھیں چنانچہ امجد کے دل میں مظہر کے خلاف حسد کا بیج پیدا ہو گیا، یہ بیج آہستہ آہستہ تناور درخت بنتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ حسد کی آگ میں جلنے بجھنے لگا۔ مظہر امجد کی اس تبدیلی کو نہ بھانپ سکا، وہ اسے اسی طرح اپنا دوست سمجھتا رہا، مظہر کے دوستوں نے اسے امجد میں آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں مطلع کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ان باتوں کو درخور اعتناء نہ سمجھا وہ بدستور امجد کو اپنا ''بیسٹ فرینڈ'' سمجھتا رہا۔ یہاں میں اس داستان کو ایک لمحے کے لیے روکتا ہوں اور آپ کو حسد کے جذبے کی کیمسٹری سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ حسد انسانی ذات کا ایک ایسا جذبہ ہے جو سب سے پہلے محنت پر حملہ آور ہوتا ہے، آپ دنیا بھر کے حاسدین کو دیکھ لیجیے یہ لوگ آپ کو ہمیشہ نکمے دکھائی دیں گے، یہ حقیقت ہے دنیا کا کوئی حاسد محنت نہیں کرسکتا کیوں؟

کیونکہ محنت اور حسد دونوں کبھی ایک ذات میں اکٹھے نہیں ہوتے۔ میں سٹوری کی طرف واپس آتا ہوں، امجد کے ساتھ بھی یہی ہوا، وہ حسد میں مبتلا ہوا تو اس نے محنت ترک کر دی، وہ سارا دن مظہر کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتا رہتا، اس دوران امتحانات ہوئے، امجد بری طرح فیل ہو گیا۔ مظہر کو اس کی ناکامی پر بہت افسوس ہوا لیکن امجد نے اس ناکامی کو بھی مظہر کے کھاتے میں ڈال دیا، وہ مظہر کی ہمدردی کو منافقت اور چالا کی گردانئے لگا۔ یہ سلسلہ مزید ایک سال چلا، اس دوران امجد دوسری مرتبہ فیل ہو گیا، وہ میڈیکل کالج سے فارغ کر دیا گیا، وہ بوریا بستر باندھ کر واپس گاؤں چلا گیا جبکہ مظہر نے تیسری مرتبہ بھی ٹاپ کیا، وہ بڑی تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا، امجد کا حسد گاؤں پہنچ کر انتقام کی شکل اختیار کر گیا، وہ مظہر کو اپنا دشمن سمجھنے لگا جبکہ مظہر اس کو بدستور اپنا دوست سمجھتا تھا اور پھر دونوں کی زندگی میں وہ رات آ گئی، مظہر لاہور سے واپس اپنے گاؤں جا رہا تھا اس کی واپسی کا صرف امجد کو علم تھا، مظہر کا گاؤں بڑی سڑک سے ذرا ہٹ کر تھا اور لوگ عموماً بڑی سڑک پر اترتے تھے اور وہاں سے پیدل چلتے ہوئے گاؤں جاتے تھے، اس رات مظہر سڑک پر اترا امجد اسے لینے کے لیے سڑک پر موجود تھا، وہ دونوں گاؤں کی طرف چل پڑے، راستے میں ایک ویران جگہ آتی تھی اس جگہ پہنچ کر امجد نے پستول نکالا، مظہر کو للکارا اور چھ گولیاں اس کے سینے میں داغ دیں، یہ اس کے حسد کی تیسری سٹیج تھی، اس سٹیج پر پہنچ کر انسان انسان سے مجرم بن جاتا ہے، امجد بھی مجرم بن چکا تھا، اس واقعے کے آخر میں کیا ہوا، مظہر اپنی جان سے گیا اور امجد آج کل کال کوٹھڑی میں پھانسی کا انتظار کر رہا ہے جبکہ گاؤں دو باصلاحیت ڈاکٹروں سے محروم ہو گیا، مجھے یہ واقعہ میانوالی کی خاتون نے خط کے ذریعے بھجوایا اور آخر میں سوال کیا، ان دونوں باصلاحیت نوجوانوں کا قاتل کون تھا؟

میں تین دن سے نوجوان کا قاتل تلاش کر رہا ہوں، میں آخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں ان

دونوں کا قاتل حسد تھا! محنت اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے سب سے بڑا تحفہ ہے، انسان اللہ تعالی کی واحد مخلوق ہے جو کسی بھی حال میں محنت، کوشش اور جدو جہد ترک نہیں کرتی، آپ کبھی ''بم بلاسٹ'' یا حادثوں میں زخمی ہونے والے لوگوں کو دیکھئے، ان لوگوں کا سارا جسم زخموں سے چھلنی ہو جاتا ہے لیکن یہ لوگ اس کے باوجود محنت ترک نہیں کرتے، لوگوں کے ہاتھ کٹ جاتے ہیں تو یہ کہنیوں کو ہاتھ بنا لیتے ہیں اور اگر خدانخواستہ ان کے بازو کٹ جائیں تو یہ پاؤں کی انگلیوں میں برش پکڑ کر خطاطی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ انسان کا محنت کا جذبہ ہے، یہ جذبہ اسے کسی حال میں پسپا نہیں ہونے دیتا لیکن حسد وہ آگ ہے جو محنت کے جذبے کو بھی جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ آپ نے اکثر جانوروں کو دیکھا ہوگا، یہ جب کسی مادہ کا پیچھا کرتے ہیں اور اس دوران اگر مادہ اپنی مرضی سے کسی ایک نر کا انتخاب کر لے تو باقی نر پیچھے ہٹ جاتے ہیں لیکن انسان اس معاملے میں کبھی پسپائی اختیار نہیں کرتا، یہ ہمیشہ انتقام پر اتر آتا ہے، یہ ناپسندیدگی اور ناکامی پر اکثر اوقات خواتین کے چہرے پر تیزاب پھینک دیتا ہے یا انہیں اور ان کے منگیتروں کو گولی مار دیتا ہے، یہ سب حسد کے جذبے کی کارستانی ہے چنانچہ میں سمجھتا ہوں حسد انسان کی زندگی کا انتہائی خوفناک جذبہ ہے، یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کے ایمان تک کو کھا جاتا ہے، میں آپ کو یہاں ایک اور دلچسپ بات بتاتا چلوں، انسان کی تاریخ میں آج تک جس شخص نے بھی ترقی کی اس نے اپنے حسد کے جذبے کو مسخر کیا، آپ ایڈیسن سے لے کر آئین سٹائن تک اور ابراہم لنکن سے لے کر مہاتما گاندھی تک اور بل گیٹس سے لے کر ڈاکٹر یونس تک دنیا کے تمام کامیاب لوگوں کی فہرست نکال کر دیکھ لیں۔ یقین کیجیے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اندر کے حسد کو سمجھا اور نہ صرف اس پر قابو پایا بلکہ اپنے اس جذبے کو مثبت شکل بھی دی اور یہ وہ کامیابی تھی جو انہیں کہیں سے کہیں لے گئی، قدرت نے امجد کو بھی یہ موقع دیا تھا، قدرت نے اسے ذرا سا

بدصورت بنایا تھا اوراس کے بعد اسے مظہر جیسے خوبصورت اور ذہین شخص کے ساتھ بٹھا دیا تھا تا کہ یہ حسد محسوس کرے اور یہ حسد اس کے اندر ایک ایسی طاقت پیدا کر دے جو اسے ترقی یافتہ لوگوں کی فہرست میں شامل کر دے، امجد کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوا لیکن یہ اسے مثبت انداز سے استعمال نہ کر سکا۔ یہ اپنی اس طاقت کو سمجھ نہ سکا چنانچہ یہ اس جذبے کی رو میں بہہ گیا اور اسی نے مظہر کا بھی نقصان کر دیا اور خود بھی کال کوٹھڑی میں جا پہنچا، اگر امجد اس جذبے کو سمجھ جاتا، یہ اس جذبے کو اپنی طاقت بنا لیتا تو یہ آج نہ صرف اس ملک کا کامیاب ڈاکٹر ہوتا بلکہ لوگ اس کی بدصورتی پر رشک بھی کرتے۔

میں اب آتا ہوں اس تکنیک کی طرف جس کی مدد سے ہم اپنے حسد کو مثبت شکل دے سکتے ہیں، یہ ایک بہت سادہ اور آسان طریقہ ہے ہمیں چاہیے ہم جب بھی کسی سے حسد میں مبتلا ہوں تو ہم فوری طور پر اپنی محنت بڑھا دیں، اگر ہم حسد سے قبل آٹھ گھنٹے کام کرتے تھے تو ہمیں فوری طور پر 12 گھنٹے کام شروع کر دینا چاہیے، اس طرح صرف ایک ماہ گزرے گا اور یہ حسد رشک میں بدل جائے گا اور اس کے بعد دنیا کی کوئی طاقت ہمیں کامیاب ہونے سے نہیں روک سکے گی، صرف محنت وہ جذبہ ہے جو ہمارے حسد کو رشک میں بدل سکتا ہے اور آپ انسان کی بدقسمتی ملاحظہ کیجیے یہ حسد میں گرفتار ہوتے ہی سب سے پہلے محنت ترک کرتا ہے اور یوں امجد جیسے انجام کا شکار ہو جاتا ہے، حسد انسانی زندگی کا سب سے بڑا تحفہ ثابت ہو سکتا ہے اگر آپ حسد کی قدر و قیمت اور طاقت کو سمجھ جائیں اور آپ اس کا مثبت استعمال سیکھ جائیں، آپ یقین کیجیے حسد انسان کا سب سے اچھا دوست ثابت ہو سکتا ہے، آپ بس اس دوست سے فائدہ اٹھانے کا ہنر سیکھ لیں۔

حوادث زمانہ اور مثبت انداز فکر

کہا جاتا ہے ایک شخص نے اپنے مطالعہ کے کمرے میں قلم اٹھایا اور ایک کاغذ پر لکھا:

☆ گزشتہ سال میں، میرا آپریشن ہوا اور پتا نکال دیا گیا، بڑھاپے میں ہونے والے اس آپریشن کی وجہ سے مجھے کئی ہفتے تک بستر کا ہو کر رہنا پڑا۔

☆ اسی سال میں ہی میری عمر ساٹھ سال ہوئی اور مجھے اپنی پسندیدہ اور اہم ترین ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ میں نے نشر و اشاعت کے اس ادارے میں اپنی زندگی کے تیس قیمتی سال گزارے تھے۔

☆ اسی سال ہی مجھے اپنے والد صاحب کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا۔

☆ اسی سال میں ہی میرا بیٹا اپنے میڈیکل کے امتحان میں فیل ہو گیا، وجہ اس کی کار کا حادثہ تھا جس میں زخمی ہو کر اُسے کئی ماہ تک پلستر کرا کر گھر میں رہنا پڑا، کار کا تباہ ہو جانا علیحدہ سے نقصان تھا۔

صفحے کے نیچے اس نے لکھا؛ آہ، کیا ہی برا سال تھا یہ!!!

مصنف کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ اُس کا خاوند غمزدہ چہرے کے ساتھ خاموش بیٹھا خلاؤں کو گھور رہا تھا۔ اُس نے خاوند کی پشت کے پیچھے کھڑے کھڑے ہی کاغذ پر یہ سب کچھ لکھا دیکھ لیا۔ خاوند کو اُس کے حال میں چھوڑ کر خاموشی سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر کے بعد واپس اسی کمرے میں لوٹی تو اس نے ایک کاغذ تھام رکھا تھا جسے لا کر اُس نے خاموشی سے خاوند کے لکھے کاغذ کے برابر میں رکھ دیا۔ خاوند نے کاغذ کو دیکھا تو اس پر لکھا تھا

☆ اس گزشتہ سال میں آخر کار مجھے اپنے پتے کے درد سے نجات مل گئی جس سے میں سالوں کرب میں مبتلا رہا تھا۔

☆ میں اپنی پوری صحت مندی اور سلامتی کے ساتھ ساٹھ سال کا ہو گیا۔ سالوں کی ریاضت کے بعد مجھے اپنی ملازمت سے ریٹائرمنٹ ملی ہے تو میں مکمل یکسوئی اور راحت کے ساتھ اپنے وقت کو کچھ بہتر لکھنے کیلئے استعمال کر سکوں گا۔

☆ اسی سال ہی میرے والد صاحب پچاسی سال کی عمر میں بغیر کسی پر بوجھ بنے اور بغیر کسی بڑی تکلیف اور درد کے آرام کے ساتھ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

☆ اسی سال ہی اللہ تعالیٰ نے میرے بیٹے کو ایک نئی زندگی عطا فرما دی اور ایسے حادثے میں جس میں فولادی کار تباہ ہو گئی تھی، میرا بیٹا کسی معذوری سے بچ کر زندہ وسلامت رہا۔

آخر میں مصنف کی بیوی نے یہ فقرہ لکھ کر تحریر مکمل کی تھی کہ: واہ ایسا سال، جسے اللہ نے رحمت بنا کر بھیجا اور بخیر وخوبی گزرا۔

ملاحظہ کیجیے : بالکل وہی حوادث اور بالکل وہی احوال لیکن ایک مختلف نقطہ نظر سے۔۔۔۔

بالکل اسی طرح اگر، جو کچھ ہو گزرا ہے، اسے اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے جو اس کے برعکس ہوتا تو، ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شاکر بن جائیں گے۔

اگر ہم بظاہر کچھ کھو بیٹھیں مگر اسے مثبت زاویے سے دیکھیں تو ہمیں جو کچھ عطا ہوا ہے وہ بہتر نظر آنا شروع ہو جائے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

"وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَـٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ" (نمل:73)

''اور بے شک تیرا رب تو لوگوں پر فضل کرتا ہے لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے''

(مصنف نامعلوم)

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (30)

دعوت اور اس کے ردوقبول کے نتائج

ہم نے پچھلی اقساط میں دعوت کے دلائل پر بات کی تھی۔ جس میں وجود باری تعالیٰ ، آخرت، توحید اور نبوت کے دلائل شامل ہیں۔ مضامین قرآن کو جس طرح ہم مرتب کرکے پیش کررہے ہیں، اس میں دلائل کے بعد دوسرا موضوع دعوت اور اس کے ردوقبول کے نتائج ہیں۔ اصولاً تو یہی قرآن کا بنیادی موضوع ہے اور یہی سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ اسی لیے ہم نے اصل ترتیب میں اسے سب سے پہلے رکھا تھا، تاہم عام طور پر لوگ قرآن مجید کے دلائل سے بالعموم واقف نہیں اور نہ اس پر بہت زیادہ کام ہوا ہے، اسی لیے ہم نے ان کو پہلے بیان کردیا تھا۔ چنانچہ دلائل کے خاتمے پر اللہ کا نام لے کر ہم دعوت اور اس کے ردوقبول کے نتائج پر گفتگو شروع کررہے ہیں۔ یہ موضوع تین ذیلی موضوعات پر مشتمل ہے:

۱) دین کی بنیادی دعوت

۲) دعوت کا ابلاغ

۳) دعوت کو ماننے اور رد کرنے کے نتائج

ہم ایک ایک کرکے اب ان پر مختصر گفتگو کریں گے اور ان کے ذیلی مضامین بیان کریں گے۔ ان پر تفصیلی بحث انشاءاللہ اپنے وقت پر کی جائے گی۔

1) دین کی بنیادی دعوت

دین کی بنیادی دعوت ایک اللہ پر ایمان اور اس کی عبادت ہے۔ یہی قرآن مجید کا سب سے

اہم اور بنیادی مضمون ہے جس کے ذیلی مضامین درج ذیل ہیں۔

الف) دعوتِ عبادتِ رب:

قرآ مجید کا مقصد نزول ایک اللہ کی بندگی کی دعوت دینا ہے۔قرآن مجید اس بات کو دو پہلوؤں سے زیر بحث لاتا ہے۔

ا۔ایک اس پہلو سے کہ اللہ پر ایمان لاکر اسے تنہا رب مانا جائے اور اسی کی عبادت کی جائے یعنی اسی کی ذات انسانوں کی پرستش، اطاعت اور نصرت وحمیت کا اصل محور ومرکز ہونا چاہیے۔

۲۔دوسرے اس پہلو سے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔یعنی شرک کی نفی کی جائے۔خدا کے بالمقابل یا اس کے ساتھ کسی بت، انسان، جن و ملک، اجرام فلکی غرض کسی بھی ہستی کو بندگی واستعانت کا مرجع اور نفع وضرر کا مالک سمجھ کر اس کا رخ نہ کیا جائے۔اس کی عبادت کی جائے نہ اسے پکارا جائے۔

ب) تعارف رب

قرآن مجید اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی بندگی کی دعوت ہی نہیں دیتا بلکہ اس کا مکمل اور جامع تعارف بھی کراتا ہے۔یہ تعارف تین پہلوؤں ں سے کرایا گیا ہے۔

ا۔ذات:

اس تعارف کا پہلا جز ذات باری تعالیٰ کا تعارف ہے۔جس میں اللہ کی ہستی اور اس کی کامل خصوصیات کا درست تصور دیا جاتا ہے۔

۲۔صفات:

قرآن مجید تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفات اور خاص کر ان صفات کا تذکرہ کرتا ہے جو مخلوق کے لحاظ سے ظہور کرتی ہیں۔ان کی دو اقسام ہیں:

الف) صفات جمال

ب) صفات جلال

۳۔ سنن اور اسرار و حِکَم

یہ تعارف رب کے حوالے سے تیسری چیز ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ کی ان سنن کا بیان ہوتا ہے جو وہ انسانوں کے معاملے میں بروئے کار لاتے ہیں اور ان حکمتوں اور اسرار کا تعارف کراتے ہیں جو اس دنیا میں کارفرما ہیں۔

سنن میں قرآن مجید یہ بیان کرتا ہے کہ فرد اور اقوام کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ہستی کس طرح ہمیشہ معاملہ کرتی ہے۔ یہ معاملہ الل ٹپ نہیں ہوتا بلکہ ایک متعین قانون کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ ان کو سنن الٰہی کہتے ہیں۔ جبکہ اسرار و حِکَم سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ حکمتیں اور معلومات ہیں جن تک انسانوں کی رسائی ممکن نہیں۔

2) دعوت کا ابلاغ

یہ دعوت اور اس کے رد و قبول کے نتائج کے ضمن کا دوسرا اہم موضوع ہے۔اس میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک دعوت پہنچانے اور ان سے مکالمہ و مخاطبت کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ وجود باری تعالیٰ کی طرح یہ بھی ایمانیات کا موضوع ہیں۔اس ضمن میں جو مضامین زیر بحث آتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱) منصب نبوت و رسالت:

اس میں یہ واضح کیا جاتا ہے کہ کسی انسان کی یہ حیثیت نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے دعوت دینے کے لیے خود شرف مخاطبت عطا کریں۔اس مقصد کے لیے انسانوں ہی میں سے کچھ اعلیٰ ترین شخصیات کو اللہ تعالیٰ اپنے علم و حکمت کی بنیاد پر چن لیتے ہیں اور انہیں یہ فریضہ سونپتے ہیں کہ وہ

انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا پیغام اس طرح واضح کر دیں کہ قیامت کے دن انسان یہ عذر نہ پیش کر سکیں کہ ان تک ہدایت نہیں پہنچ سکی۔ چنانچہ سابقہ انبیا کے واقعات اور خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے مخاطبین سے ہونے والا مکالمہ بہت تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں زیر بحث آیا ہے۔

نبیوں میں سے بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی دعوت اس درجہ کے واضح دلائل و براہین کے ساتھ ان کے مخاطبین پر واضح کر دی جاتی ہے کہ ان کے اللہ کی طرف سے بھیجے جانے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو رسول کہا جاتا ہے جو دعوت دین پہنچانے اور لوگوں کی رہنمائی کرنے کے ساتھ نہ ماننے والوں پر آخری درجہ میں اتمام حجت کر دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کی اقوام پر دنیا ہی میں سزا و جزا کی سنت روبہ عمل کر دی جاتی ہے۔

۲) فرشتے:

ان انبیا پر عام طور پر فرشتوں کے ذریعے سے وحی کی جاتی ہے اور یہ فرشتے ہر طرح کی شیطانی آلائش سے پاک رکھتے ہوئے اس پیغام کو اللہ کے پیغمبروں تک پہنچاتے ہیں۔ یہ فرشتے وہ کارکنان قضا و قدر بھی ہیں جو کائنات کا سارا تکوینی نظام اذن الٰہی سے چلا رہے ہیں۔ نیز مشرکین ان فرشتوں کو خدائی میں شریک سمجھتے تھے۔ اس بات کی تردید اور فرشتوں کا اصل کام، ان کے مکالمات اور کردار وغیرہ تفصیل سے قرآن مجید میں زیر بحث آئے ہیں۔

۳) صحف سماوی:

انبیا علیھم السلام پر نازل ہونے والا کلام الٰہی صحیفوں اور کتابوں کی شکل میں انسانوں کی ہدایت کے لیے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں ان سے استفادہ کر سکیں۔ ختم نبوت

کے بعد یہ کلام الٰہی قرآن مجید کی شکل میں تا قیامت انسانوں کے لیے محفوظ اور ہر طرح کی تحریف سے پاک کر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا تورات، زبور، انجیل اور دیگر صحائف کے حوالے، ان کی تعلیمات اور تفصیلات زیر بحث آتی ہیں۔

۳) دعوت کو ماننے اور رد کرنے کے نتائج (انذار و تبشیر)

یہ اس سزا و جزا کا بیان ہے جو انبیا کی دعوت اور ان کے پیش کردہ مطالبات کو رد کرنے یا ماننے کی شکل میں روز قیامت ملے گی۔ رسولوں کے ضمن میں اس کا ایک نمونہ اسی دنیا میں قائم کر دیا گیا ہے۔ آخرت کی ایک دلیل کے علاوہ انذار و تبشیر کے پہلو سے ان اقوام کے قصے قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔ جبکہ اپنی کامل شکل میں یہ سزا جزا کل انسانیت کے لیے روز قیامت برپا ہوگی۔ اس سے ذیلی مضامین درج ذیل ہیں جن میں سے ہر ایک پر بہت تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں گفتگو کی گئی ہے۔

۱) موت اور برزخ

۲) احوال قیامت

۳) سزا جزا کے مقامات

[جاری ہے]

زندگی میں پیش آنے والے ناگوار حالات
روزے دار کے ایک سخت دن کی طرح
آخر کار گزر جاتے ہیں (ابویحییٰ)

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (35)

نماز سے فارغ ہو کر ہم کھانے کے لئے ہوٹل تلاش کرنے لگے۔ ایک ہوٹل پر مچھلی کی تصویر بنی ہوئی تھی، ہم نے اسی کا انتخاب کیا۔ کھانے کا آرڈر دینے کے لئے میں نے ان کے بورڈ پر بنی کھانے کی تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔ ہوٹل جھیل کے عین کنارے پر تھا۔ موسم کافی سرد ہو رہا تھا۔ کھانے میں روسٹ مچھلی اور پتلی دال آئی جو کہ یہاں "چوربا" کہلاتی تھی۔ اس کے ساتھ روٹی کے طور پر وہی لکڑی والے بن تھے جنہیں کھا کھا کر اب ہماری داڑھیں درد کرنے لگ گئی تھیں۔ اہلیہ کہنے لگیں، "مجھے تو چاول ہی منگا دیں۔" ویٹرس کو اچھی خاصی عربی اور انگریزی آتی تھی۔ چاول منگوائے۔ یہاں کے چاول بھی خوب تھے۔ پنجاب کے باسمتی چاول کھانے والوں کے سامنے چنیکے سائز کے موٹے موٹے چاول لا کر رکھ دیے گئے۔ چوربا اور مچھلی البتہ کافی مزیدار ثابت ہوئے۔

کھانے سے فارغ ہو کر کافی پینے کے بعد ہم کچھ دیر جھیل کے کنارے پیدل چلے۔ مجھے سردیوں کا موسم بہت پسند ہے۔ جدہ میں تو یہ موسم ہمیں نصیب نہیں ہوتا۔ اس وقت اگست کے ابتدائی دنوں میں ہم یوزن گولو کی سردی کو انجوائے کر رہے تھے۔

بادل، بارش اور چشمہ

اگلی صبح آنکھ کھلی تو بادل پہاڑ کی چوٹی سے اتر کر اس کے نصف تک آ چکے تھے۔ ساری رات یہ بادل ہلکی ہلکی پھوار کی صورت میں برستے رہے تھے جس سے پورے علاقے میں کیچڑ ہو رہا تھا۔ قریبی ہوٹل میں ناشتہ کرنے کے لئے گئے۔ ہوٹل کے اندر ایک خوبصورت منظر تھا۔ ہوٹل کے لان میں بڑے بڑے تالاب بنے ہوئے تھے جن میں سرد پانی کی مچھلیاں پالی گئی تھیں۔ دریا

سے پمپ کے ذریعے پانی ان تالابوں میں ڈالا جاتا اور یہاں مچھلیوں کی فصل تیار کی جاتی۔ اس وقت ہوٹل کا ایک ملازم مچھلیوں کو خوراک فراہم کر رہا تھا اور یہ اچھل اچھل کر پانی سے باہر آ کر خوراک جھپٹنے میں مصروف تھیں۔

یہاں سے وہی بوفہ اسٹائل ناشتہ ملا جو ہم روزانہ ہی کر رہے تھے۔ ناشتے کے بعد ہم نے پیدل ہی علاقے کا سروے کرنے کا ارادہ کیا۔ ہوٹل کے عقبی جانب دریا بہہ کر جھیل کی طرف جا رہا تھا۔ دریا کے دونوں کناروں کو پختہ کر دیا گیا تھا اور ان کے ساتھ ساتھ کچے ٹریک بنائے گئے تھے۔ درمیان میں کئی مقامات پر دریا پر لکڑی کے پل بنائے گئے تھے۔ دریا کے ایک جانب بہت سے ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ ان میں لکڑی کا فرنیچر تھا۔ تھوڑی دور چل کر ہم ایک چشمے پر جا پہنچے جو پہاڑ کی بلندی سے دریا میں گر رہا تھا۔ چشمے پر جگہ جگہ بند باندھ کر اس کا پانی زرعی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔

اب ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح اڑ کر بادلوں میں جا پہنچیں۔ واپس ہوٹل آ کر کار میں بیٹھے اور جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں سے ایک سڑک پہاڑ کے اوپر جا رہی تھی۔ آگے جا کر یہ ایک کچی سڑک میں تبدیل ہو گئی۔ دونوں طرف گھنے سبزے کے بیچ میں سے گزرتے ہم اوپر جا رہے تھے۔ منظر کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ شوگران کی چڑھائی میں نظر آتا ہے۔ نصف پہاڑ کی بلندی پر پہنچ کر ہم بادلوں میں داخل ہو گئے۔ جیسے جیسے ہم اوپر جا رہے تھے، بادل گھنے ہوتے چلے جا رہے تھے۔

گاڑی مسلسل پہلے اور دوسرے گیئر میں چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اب صورتحال یہ تھی کہ گھنے بادلوں کی وجہ سے چند فٹ سے آگے نظر نہ آ رہا تھا۔ بل کھاتی ہوئی سڑک کا کنارہ بھی بمشکل دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک ایک بڑا سا چشمہ نظر آیا جس میں سے

ڈھیروں ڈھیر پانی بہہ کر نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں دو تین سعودی فیملیاں اپنی GMC جیپ اور فورڈ کار پر آئے ہوئے تھے۔ انہیں پٹرول کا اچھا خاصا خرچ برداشت کرنا پڑا ہو گا مگر اتنی بڑی فیملی کو گاڑی پر لا کر انہوں نے ہوائی جہاز کا جو کرایہ بچایا ہو گا وہ پٹرول کے خرچ سے زیادہ ہی ہو گا۔

یہ لوگ بھی ہماری طرح ایڈونچر پسند تھے۔ چشمے میں سے کار گزارنا ایک مشکل کام تھا۔ انہوں نے اپنی کار وہیں کھڑی کی اور سب کے سب جیپ میں بیٹھ کر بلکہ زبردستی ٹھنس کر آگے روانہ ہو گئے۔ بادل اب ہلکی ہلکی پھوار کی صورت میں برس رہے تھے۔ کچھ دیر ہم یہیں رک کر موسم سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ میں چہرہ اوپر کر کے اس پر پڑنے والی پھوار سے لطف اندوز ہونے لگا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ یہاں کس قدر خوبصورت اور دلفریب مقامات ہیں تاکہ انسان یہاں آ کر انجوائے کر سکیں۔ گھنے سبزے سے ڈھکے پہاڑ، ان کے درمیان تیزی سے بہتے آبشار، شور مچاتے دریا، پرسکون جھیلیں، برفیلی وادیاں یہ سب انسان کے اعصاب کو سکون دیتے ہیں۔ اسے اگر جنت ارضی کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا مگر اس جنت ارضی میں دو خامیاں موجود ہیں۔

دنیا کی اس جنت میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے انسان کے پاس دولت ہونی چاہیے۔ جو لوگ پیسے سے محروم ہیں، اس جنت کی نعمتیں ان کے لئے نہیں ہیں۔ دوسری خامی یہ کہ امیر افراد کے لئے بھی دنیا کا یہ سارا لطف عارضی ہے۔ انسان کے پاس جتنی بھی دولت ہو، ایک دن ایسا آتا ہے کہ اسے اس دنیا سے جانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد پھر اس کا مال و دولت پیچھے رہ جاتا ہے۔ ہر انسان کی یہ شدید خواہش ہے کہ اسے زندگی میں ایسی

انجوائے منٹ ملے جو کبھی ختم نہ ہو مگر اس دنیا کا ہر مزہ ایک دن ختم ہو کر رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں خوبصورت مقامات رکھ کر انسان کے اس شوق کو ہوا دی ہے کہ وہ اس سے ہزاروں گنا زیادہ پر لطف زندگی کو حاصل کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی جنت تیار کر رکھی ہے جس میں داخلے کے لئے پیسہ نہیں بلکہ نیک عمل شرط ہے۔ اس جنت میں داخلہ خالصتاً میرٹ کی بنیاد پر ہوگا۔ اس جنت میں جگہ، موجودہ دنیا کی طرح عارضی نہیں بلکہ مستقل بنیادوں پر الاٹ کی جائے گی۔ اس جنت میں انسان کو وہ نعمتیں ملیں گی جن کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ اس جنت میں ہر امیر و غریب اپنے عمل کی بنیاد پر داخل ہو سکتا ہے۔

اس مقام سے واپس آنے کو جی نہ چاہ رہا تھا مگر اب مسلسل پھوار سے کیچڑ پیدا ہو رہا تھا اور یہ خطرہ تھا کہ واپسی پر کہیں ہم پھسلتے ہوئے ایک گھنٹے کا سفر چند سیکنڈ میں طے نہ کر لیں۔ اب ہم پہلے گیئر میں واپس آ رہے تھے۔ پھوار کا پانی درختوں سے چھن کر گاڑی کی چھت پر گر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ہم نیچے آ پہنچے۔ اب یوزن جھیل نظر آ رہی تھی اور ایک نہایت ہی خوبصورت منظر پیش کر رہی تھی۔ بلندی سے پانی کا نظارہ ایسا منظر ہے جو انسان کو مسحور کر دیتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے خالق کائنات نے جنت میں اونچے باغات اور نیچے بہنے والے دریاؤں اور نہروں کا ذکر کیا ہے۔ نیچے اتر کر ہم جھیل کنارے ایک ہوٹل میں آ بیٹھے۔ یہاں ایک بڑی آبشار پہاڑ سے گر رہی تھی۔ غالباً یہ وہی چشمہ تھا جسے ہم اوپر دیکھ کر آئے تھے۔ آبشار کے گرنے سے فضا میں پانی کا ایک بادل سا تشکیل پا رہا تھا جو پھوار کی صورت میں چہرے پر نہایت ہی بھلا محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں گرما گرم کافی پینے کے بعد ہم واپس اپنے ہوٹل گئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد دوبارہ نکلے۔

غزلیات

پروین سلطانہ حنا

☆☆☆☆☆☆

ہمارے شہر میں خوف و ہراس رہتا ہے

جسے بھی دیکھتی ہوں میں، اداس رہتا ہے

بچھڑ گیا ہے وہ مجھ سے، زمانہ لاکھ کہے

یہیں کہیں وہ میرے آس پاس رہتا ہے

یہ وضعداری کہاں ہے یہاں کے لوگوں میں

مگر ہمیں تو محبت کا پاس رہتا ہے

میں اپنے رَب سے بھلا دور کیسے ہو جاؤں

اندھیری رات میں وہ بن کے آس رہتا ہے

بھُلا کے اس کو یہاں لوگ کیسے جیتے ہیں؟

مرے لئے تو ہمیشہ وہ خاص رہتا ہے

اُسی کے زیرِ نگیں ہیں زمین کے موسم

ہیں بُرج اس کے ہی تابِع، وہ راس رہتا ہے

وہ سامنے ہو تو ہر شے مجھے حسین لگے

وہ دور ہو تو یہ دل ناسپاس رہتا ہے

اسے بھی رنگِ حنا سے ہے ایک نسبت سی
وہ شخص خود بھی بہت خوش لباس رہتا ہے

احمد بشیر طاہر

☆☆☆☆☆☆

زباں سے خیر کہوں اور خیر عام کروں
نہیں رسول کہ میں حجتیں تمام کروں
کسی کے کفر کا، ایمان کا، کہوں کیسے؟
کسی کے قلب میں جھانکوں تو کچھ کلام کروں
خدا سے رحم کا طالب ہوں، پس یہ واجب ہے
خدا کے بندوں سے رحمت کا التزام کروں
کسی کے مذہب و فرقہ سے کچھ نہیں لینا
مجھے تو حکم ہے جو بھی ملے سلام کروں
خدا کا کام ہے، وہ فیصلے کرے سب کے
مجھے ہے امر کہ بندوں کا احترام کروں
خدا کرے وہ مری ذات میں اثر پیدا
محبتوں کی نمو ہو جہاں قیام کروں

ابو یحییٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابو یحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابو یحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ